بیوی:۔ موئی کی شامتیں آئی ہیں۔ یہ بلا بوغمہ کیا بک رہی ہے۔

بڑھیا:۔ تو کیا تمہارے دبیل ہیں؟ کچھ کسی کے لینے میں نہیں۔ گھڑی بھر نکل آتے تھے۔ تم ہم سے ہم تم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں گے۔

بیوی:۔ ہرگز نہ آنا۔

بڑھیا:۔ اس ضد پر تو ضرور آئیں گے۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بنا لیتی ہو۔

بیوی:۔ آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔

بڑھیا:۔ کیا تاکت، کیا مجال۔ منہ بنواؤ۔ جوتیاں ماریں گی، بڑی بے چاری۔

بیوی:۔ لے اٹھو، یہاں سے ٹہلو۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی۔

بڑھیا:۔ (ایک ٹھٹھا لگا کے) آج تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔ مارو بڑے باپ کی بیٹی ہو تو۔

باپ کے نام پر بیوی کو غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ تھر تھر کانپنے لگیں۔

بیوی:۔ دور ہو یہاں سے، کہتی ہوں۔

بڑھیا:۔ اب تو ہم جوتیاں کھا کے ہی جائیں گے۔

بیوی:۔ (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں گی۔

میں:۔ بیگم جانے دیجئے۔ موئی بے تکی ہے۔

بڑھیا:۔ (مجھ سے) تو کچھ نہ بولنا۔ مال زادی، تجھے کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی:۔ (جوتی پیر سے لے کر) ایک دو تین۔ اب راضی ہو؟

میں:۔ بیگم جانے دیجئے۔ (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی:۔ نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا:۔ اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر چار پانچ اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دیئے اور دو ہتھڑ مارنا شروع کیا۔ "ہے ہے! ہے ہے! مجھے جوتیاں ماریں۔ اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی جلن مجھ پر اتاری۔ ہائے مارا! ہائے مارا"۔ چلا چلا کے دہائی دینا شروع کی۔ باورچی خانے سے بوا امیرن اٹھ کے دوڑیں۔ بیگم صاحب اپنے دالان میں چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہو گئی۔

بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دو ہتھڑ مارنا شروع کئے۔ "اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں۔"

بیگم صاحب:۔ لے مجھے کیا معلوم تھا کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں۔ نہیں تو آکے بچا لیتی۔ آخر بات کیا ہوئی؟

بڑھیا:۔ (میری طرف اشارہ کر کے) اس مال زادی نے مار کھلوائی۔ ارے اس نے مار کھلوائی۔ میں ٹھگ ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت سامنا ہوا، کچھ کہتے نہیں بن پڑتا۔

بیوی:۔ پھر ان کا نام لئے جاتی ہے۔

بڑھیا:۔ ہم تو نام لیں گے۔ دیکھیں تم کیا کرتی ہو۔

بیگم صاحب:۔ آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا:۔ مجھ نگوڑی نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لے بھلا کیا گناہ کیا؟

بیوی:۔ تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں، پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا:۔ کیا مطلب تھا؟ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تو سہی جو اپنا عوض نہ لے لوں۔ تم نے مارا تو ہے۔

بیگم:۔ چل شفتل، تو کیا بدلہ لے گی؟ ذرا کسی بھلاوے پر نہ پھولنا۔

بڑھیا:۔ میں تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو چاہو کہہ لو۔ تمہارا ہک ہے۔

بیگم:۔ تیری ہک والی کی ایسی تیسی۔ نکل یہاں سے۔

بڑھیا:۔ لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں۔

(یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی) بڑی نکالنے والی۔ جاتے ہیں۔ دیکھیں تو کیوں کر نہیں آنے دیتیں۔

بیگم:۔ (بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟

بیوی:۔ اماں جان! آپ کے سر کی قسم! میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھری کھاٹ پر سے سو کے آئی تھی۔ سینکڑوں باتیں تو ان بے چاری کو سنا کے رکھ دیں۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپکی ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی بات تو

ناگوار نہیں ہوئی، کیوں کہ میں اسے دیوانی سمجھے ہوئے تھی، مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آن بیٹھی۔

بیگم صاحب:۔ (میرے چلے آنے کے بعد. بہو سے) اوہی بیٹا! تم نے تو اس بڑھیا نگوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا، پھر موئی ایک شغل بازاری کے لئے۔ آخر تمہیں اس کی پرچک لینا کیا ضروری تھی۔

امیرن:۔ اچھا اس کو جانے دیجئے۔ جیسی اس نے بد زبانی کی تھی، اپنی سزا کو پہنچی۔ یہ پوچھئے کہ کسبی خانگیوں سے میل جول کیسا؟ اور کسبی بھی وہ جس سے میاں سے آشنائی ہو۔ ابھی وہ لا کے سر پر بٹھا دیتے تو کیسی کیسی مانامت ڈالتی۔ اور خود فرض کر کے جا کے بلا لائیں؟

بیگم:۔ (امیرن سے) اس کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں۔ باہر جس کا جی چاہے آئے، گھر میں کسی کا کیا کام ہے۔ اے لو ان سے (اکبر علی خاں کے باپ) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں۔ میں نے نہیں ہامی بھری۔ بوا امیرن! میں یہ سوچی کہ آج کو مہمان طریق کھڑی تڑی چلی آئے گی، کل کو میاں گھر میں بٹھا لیں گے۔ تو یہ چھاتی پر مونگ کون دلوائے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن:۔ سچ ہے بیگم صاحب! اول تو مونڈھے پر بیٹھنے والیوں کا گھر گرہستیوں میں کام ہی کیا ہے۔ اگلے لوگ کہتے تھے: ایک درجہ مرد کو گھر میں بلا لے، بد عورتوں کو نہ بلائے۔

بیگم:۔ بوا! بات یہ ہے کہ مرد اگر چلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے، بھاگڑ کے دنوں میں برسوں حسین خاں ہمارے گھر میں چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا سہنا رہنا، مگر مجال ہے کہ انہوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو، یا بات سنی ہو۔ دن دن بھر صحنچی میں گھسی بیٹھی رہتی تھی۔ ماما اصیلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھی۔

امیرن:۔ ایک تو یہ کہ تم صحنک کی کھانے والی بیوی صاحب زادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھو گی، کہاں تک براؤ ہو گا۔ کہیں اس نے کتھے چونے کی کلسیوں میں ہاتھ ڈال دیا،

تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا! دوسرے موئی ٹکاہیاں ان کا ایتبار (اعتبار) کیا؟ سینکڑوں عارضوں میں گھری ہوتی ہیں۔ ان کی تو پرچھاویں سے بچنا چاہیئے۔

بیگم صاحب:۔ ایک بات؟ کبھی باتوں کا براؤ ہونا چاہیئے۔ پرچھانواں، نانگھن، ٹونے، ٹوٹکے۔ بوا کون کہے۔ ان کو تو سمجھ نہیں۔ اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمود علی کی بہو کو سوت نے جو نمک کھلا دی۔ دین و دنیا سے جاتی رہی۔ نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن:۔ جی ہاں! اے لو کیا میں جانتی نہیں۔

بیگم:۔ یہ سوتاپے کا ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ اس میں جہاں تک الگ تھلگ رہے اچھا۔ یوں تو الگ تھلگ رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو۔ اس موئی ٹکے کی کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی؟ دعا، تعویذ، گنڈے، کیسے کیسے نقش میرے سرہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن:۔ پھر اس۔۔۔۔ کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا۔

بیگم:۔ اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا سگا ہے۔ جس دن معلوم ہو گیا، میں نے کھڑے کھڑے نکال دیا۔

امیرن:۔ مگر بیگم! ایک بات کہوں گی خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم:۔ یہ خوب کہی۔ میاں کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گزری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی کسی زمانے میں میاں سے تھی۔

امیرن:۔ (قہقہہ لگا کے) نہیں بیگم صاحب!

بیگم:۔ کیا میں جھوٹ کہوں گی؟ جب ہی تو وہ دہراتی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن:۔ بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیئے تھا۔ سسرے کی حرم کو اپنی جوتیاں۔۔۔۔،

بیگم:۔ بوا! ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں۔ سچ کہوں مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی، ان کے منہ پر کہتی ہوں۔ آج کو موئی نکہائی کے چلتے سسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں، کل ساس کو ماریں گی۔

امیرن:۔ نہیں خدا نہ کرے۔ مگر ہاں بات کہنے ہی میں آتی ہے۔

ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب بے چاری کو ایسے کونچے دیئے کہ آخر چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منہ نوچ

لوں۔

رسوا۔ ہائیں ہائیں یہ غصہ!

روکئے گا ذرا طبیعت کو

کہیں ایسا نہ ہو کہ خفت ہو

امراؤ۔ مرزا صاحب! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

رسوا۔ میرے نزدیک تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور مدن کی ماں بے چاری ناحق پٹی۔ حق تو یوں ہے، اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

امراؤ۔ واہ مرزا صاحب! آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا۔ جی ہاں میرے نزدیک انصاف یہی ہے۔ اس معاملے میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی کی بیوی کا تھا۔

امراؤ۔ ان بے چاری کا کیا قصور تھا؟

رسوا۔ ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو فوراً ڈولی بلوا کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراؤ۔ مدن کی ماں پر خوب چیخے، خوب چلائے کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے خان صاحب آئے تو پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا تھا۔ وہ الٹے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔

رسوا۔ بڈھے کی عقل صحیح تھی۔

امراؤ۔ صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے! ذرا مدن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھی، اسی سے اس کی پرچک لیتے تھے۔ کیوں نہ پرچک لیتے، مدن کی ماں ان کی پرانی آشنا تھی۔

رسوا۔ پھر آپ ہی قائل ہو جیئے۔ یہ عین وضع داری تھی۔ اچھا اب ایک بات اور بتا دیجئے۔ مدن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی یا گھر گرہست۔ اور بوا امیرن کون تھیں؟

امراؤ:۔ مدن کی ماں موئی دھنینی تھی۔ جوانی میں خراب ہو گئی تھی۔ بوا امیرن ایک دیہاتی عورت تھیں۔ ان کا مکان سندیلہ کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ بھی بڑے خان صاحب کے پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی۔ وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی۔

رسوا:۔ بوا امیرن سے اور بڑے خان صاحب سے تو کوئی تعلق نہ تھا۔

امراؤ:۔ نہ۔ خدا کو جواب دینا ہے۔ امیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا محلہ کہتا تھا کہ وہ جوانی میں رانڈ ہو کر یہاں نوکری کو آئی تھی۔ اس دن سے کسی نے اس کو بدراہ نہیں دیکھا۔

رسوا:۔ پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہو گئے۔ اب پوچھئے کیا پوچھتی ہیں۔

امراؤ:۔ تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔

رسوا:۔ بہت بڑا مقدمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک نیک بختیں، دوسری خرابیں، تیسری بازاریاں۔ اور دوسرے قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر اتارو ہو جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ وہی عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہو گئی ہوں۔ کیا تمہیں اتنی سمجھ نہیں ہے کہ وہ بیچاریاں جو تمام عمر چار دیواریوں میں قید رہتی ہیں۔ ہزارہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں، اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں، مگر برے وقت میں یہی بیچاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانے میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں، دولت پاس ہوتی ہے، تو اکثر باہر والیاں مزے اڑاتی ہیں، مگر مفلسی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بروں کی جان کو صبر کرتی ہیں۔ پھر کیا انہیں اس کا کوئی فخر نہ ہو گا۔ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بری نگاہ سے دیکھتی ہیں، انتہا کا ذلیل سمجھتی ہیں۔ توبہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی معاف نہیں کرتیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کیسی ہی خوبصورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بے وقوف مرد بازاریوں پر، جو ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں، فریفتہ ہو کر انہیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آجاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے، اس لئے کہ وہ اس حال میں بھی اپنے مردوں کو

الزام نہیں دیتیں، بلکہ بد کار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

امراؤ:۔ یہ تو سب صحیح ہے، مگر مرد کیوں ایسے بیوقوف بن جاتے ہیں۔

رسوا:۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں جدت پسندی ہے۔ ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے، خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، طبیعت اکتا جاتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا تغیر اس کی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاہدان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں اسے ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے جو کبھی اس کے خیال میں نہ تھی۔ یہاں بھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے کمروں میں پہنچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔

امراؤ:۔ مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔

رسوا:۔ ہاں یہ سچ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون نے اس امر کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے عزیز و اقارب، دوست احباب ملامت کرتے ہیں۔ اس خوف سے اکثر کی جرات نہیں ہوتی۔ مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے، وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں، اس لئے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہو گا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں ان کو اخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو، کوئی سن نہ لے۔ دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر، تخلیہ میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی۔ مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے، دن دہاڑے سر چوک رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھ جانا، گاڑی میں کھڑکیاں کھول کر ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا، ہاتھ میں ہاتھ لے کے میلے تماشوں میں لئے پھرنا، ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔

امراؤ:۔ یہ تو صحیح ہے، مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا:۔ خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں۔ اور یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔

دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اختیار حاصل نہیں ہے۔ اس لئے وہ رؤسا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں، کیوں کہ ان کا آذوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے۔ اس لئے ان کی اولاد سے بہت ہی چھپے چوری ملتی ہیں۔ اور شہروں میں تو آزادی ہے۔ کون کس کا دباؤ مانتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ۔ مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں، مثلاً میاں ارشاد علی کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔ جب ان کو ان کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور اہل شہر کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو زیادہ شغف اور انہماک نہیں ہوتا۔

(2)

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل

رسوا۔ ہاں! وہ آپ کی نوچی کیا ہوئی؟ اے بھلا سا نام تھا۔

امراؤ۔ آبادی؟

رسوا۔ آبادی۔ صورت تو اچھی تھی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا سن دس بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہو گی۔

امراؤ۔ مرزا صاحب! آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا۔ یاد کو کیا چاہیئے۔ واقعے میں بہت قطع دار عورت ہو گی۔ ہم بھی اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہو گی۔

امراؤ۔ تو یہ کہیئے کہ آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے۔

رسوا۔ سنو، امراؤ جان! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے، مجھے

ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو (خدانخواستہ) میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

امراؤ:۔ اور اگر کوئی مرد حسین نظر آئے؟

رسوا:۔ اپنا نام اس کے امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوا دینا، بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراؤ:۔ کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا:۔ شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی فروگزاشت نہیں کی گئی۔

امراؤ:۔ سیدھی سی ایک یہ بات کیوں نہیں کہہ دیتے۔ ع

شرعاً تو جانتے نہیں، عرفاً درست ہے

رسوا:۔ یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراؤ جان! میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں، بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلانے یا بدکار بنانے کی کوشش کرتے ہیں، میری رائے میں قابل گولی مار دینے کے ہیں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں ہے۔

امراؤ:۔ سبحان اللہ!

رسوا:۔ خیر اب اس فضولیات کو رہنے دیجئے۔ آبادی جان کا حال کہئے۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا۔

جواں ہوتے ہی وہ تو اور ہی کچھ ہو گئے اے دل
کہاں کی پاک بازی، ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ شکل و صورت نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا:۔ اب کیا ہوئی۔ خدا کے لئے جلدی کہئے۔ مرچ شہر چلی گئی، مر گئی، آخر آفت ہی کیا ہوئی

جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

امراؤ:۔ ہم سے گئی جہان سے گئی۔

رسوا:۔ آخر ہے اب کہاں؟

امراؤ:۔ اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

رسوا:۔ یہ کہئے کل جوانی شگفت۔

امراؤ:۔ جی ماشاء اللہ سے خوب پھلیں پھولیں۔ صورت بگڑ گئی، رنگت الٹا توا ہو گئی، ناک بیٹھ گئی، تمام بدن میں چھٹے پڑ گئے، بال گر گئے، غرضیکہ ستر کرم ہو گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

رسوا:۔ یہ ہوا کیا تھا؟

امراؤ:۔ اے ہے، ہوا کیا تھا۔ موئی لونڈوں گھیری، سفلی، چھچھوری۔ میں نے بہت چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا۔ استاد کو نوکر رکھا، تعلیم دینا شروع کی، مگر اس کا دیدہ ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی، میں نے کمرا علیحدہ کر دیا تھا۔ شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات گالم گلوچ، دھینگا مشتی، جوتم جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی پر بند نہیں۔ جو آیا وارد۔ میں نے مارا، پیٹا، سمجھایا، مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچپنے ہی سے اس کی نگاہ بد تھی۔ اس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے کھیلا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا بچے ہیں، کھیلنے دو۔ آخر کچھ ایسی باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمدورفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گوایا کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ وہ شریف خاندان سے تھے مگر طبیعت پاجی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا، نہ اپنی حیثیت دیکھی۔ ایک دن سرشام کیا دیکھتی ہوں، ڈیوڑھی میں بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں۔

چھٹن صاحب:۔ اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا کروں۔ امراؤ جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی:۔ ہٹو! ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کاہے کا؟

چھٹن نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا "ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔"

آبادی:۔ پھر تمہیں کیا؟

چھٹن:۔ (ایک بوسہ لے کر) ہمیں کیا؟ جان جاتی ہے، مرتے ہیں۔

آبادی:۔ موئے چار آنے تو دیئے نہیں جاتے، مرتے ہیں! مرتے سب کو دیکھا، جنازہ کسی کا نہیں دیکھا۔

چھٹن:۔ چار آنے؟ جان حاضر ہے۔

آبادی:۔ نگوڑی جان کو میں لے کر کیا کروں گی؟

چھٹن:۔ لو ہماری جان کسی کام کی ہی نہیں۔

آبادی:۔ لے اب باتیں نہ بناؤ۔ چونی جیب میں پڑی ہو تو دیتے جاؤ۔

چھٹن:۔ واللہ! اماں کی تنخواہ نہیں بٹی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی:۔ اچھا تو جان چھوڑو، جاؤ۔

چھٹن:۔ اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے پڑے ہوئے تھے، نکال لئے۔

چھٹن:۔ تمہیں ہمارے سر کی قسم! یہ پیسے نہ لینا۔ باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مسی منگائی ہے۔

آبادی:۔ تمہارے سر کی قسم! میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن:۔ آخر کیا کرو گی۔ پرسوں چونی لے لینا۔

آبادی:۔ واہ! خاگینہ لیں گے۔

چھٹن:۔ تین پیسے کا خاگینہ! اچھا ایک پیسہ لے لو۔

آبادی:۔ تین پیسے کا خاگینہ کچھ بہت ہوا؟ نگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے۔ بیوی لینے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں پیٹ میں درد ہوگا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنے کا خاگینہ کھا گئی، کچھ بھی نہیں ہوا۔

(میں نے دل میں کہا کیوں نہ ہو۔ موئی کال کی ماری بلا نوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھالیں تو بد ہضمی ہو جائے)۔

رسوا:۔ کیا اسے کال میں لیا تھا؟

امراؤ:۔ جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بچ گئی تھی۔ تین دن کے فاقے سے تھی۔ میں نے روٹی

کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا، میرے پاس رہ، مگر نہ رہی۔

رسوا:۔ کم بخت کبھی پھر بھی آئی تھی؟

امراؤ:۔ جی! کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی۔ سال میں ایک دو مرتبہ آجایا کرتی تھی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی، خدا جانے جیتی ہے یا مر گئی ہے۔

رسوا:۔ ذات کیا تھی؟

امراؤ:۔ پاسی۔

رسوا:۔ اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا۔ چھٹن نے چونی دی یا نہیں۔

امراؤ:۔ میری جانے بلا۔ چھٹن کے جانے کے بعد میں نے منہ ہی منہ میں موئی کو خوب کچلا۔ پیسے چھین کے چوک میں اچھال دیئے۔

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرا تھا۔ کوئی دو روپے مہینے کرائے کا۔ اس میں ایک رنڈی آکے رہی تھی حسنا۔ ابھی جوان تھی۔ اس کی اور آبادی کی پرگت خوب ملی۔ دن بھر وہیں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ساری خصلتیں حسنا کی اس نے اختیار کر لیں۔ جیسی وہ رنڈی تھی ویسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا، پاؤ بھر پوریاں تیل کی لئے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سینکڑہ کے لیتا آیا۔ کسی سے دو گز نینو کی فرمائش ہے۔ مخملی بوٹ کا چونگا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گرگے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صافے بندھے ہوئے۔ کف دار کرتے یا انگرکھے کمر کے پاس سے چست۔ کوئی دھوتی باندھے ہے، کوئی چست گھٹنا ڈاٹے ہے۔ ہاتھ میں لٹھ ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حسنا ٹھمک ٹھمک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ برن والی سرا میں جا کے ایک بوتل ٹھرے کی آڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے جھامتے، لڑکھڑاتے، ناچتے، گاتے۔ بی حسنا بھی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سر راہ گالم گلوچ، نوچم کھسوٹ، جو تم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک تو رستے میں گر پڑے، تین چار میلے تک پہنچے۔ وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار ہوا اس نے بی حسنا کو گانٹھ لیا، اور یاروں کی دھتا بتائی۔ اپنے گھر لے گیا یا انہی کے کمرے پر آکے ٹھہرا۔ اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے، کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں، گالیاں دے رہے ہیں، ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حسنا دل تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برق انداز چلا

آیا۔ اس نے مجمع خلاف قانون کو برہم کیا، سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روادار ہوتی۔ آخر حسین علی (میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے، ان کے خدمت گار کا نام تھا) کے ساتھ نکل گئیں۔ اس کے گھر جا کے بیٹھیں۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی، گھر سے نکل گئی۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انہیں پرواہ نہ ہوئی، مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکاوے۔ بی آبادی کو چولہا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھیں۔ بہر طور چند روز یوں گزرے۔ یہیں ایک بچہ جنیں۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا۔ دو مہینے کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپے مہینے کی ڈگری ہو گئی۔ تین روپے نواب دیتے تھے۔ ڈیڑھ روپے میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پر بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلے کے ایک لڑکے منے کے ساتھ بھاگیں۔ اس لڑکے کی ماں پٹھانی، کٹنی بڑی مشہوروں میں تھی۔ جہاں دو چار لفندریاں اور رہتی تھیں وہیں ان کا بھی ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر وسعت ہوئی۔ منے برائے نام رہ گئے۔ میاں منے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت، پٹھانی کو جل دے کے انہیں وہاں سے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا۔ وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پر متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے۔ یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں۔ وہاں انہوں نے محمد بخش گلو کنجڑن کے بیٹے سے راہ و رسم پیدا کی۔ بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا۔ بیٹے سے کہا۔ اس نے خوب جوتے مارے۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے میاں امیر۔ نواب امیر مرزا کے خدمت گاروں میں نوکر تھے۔ یہ فن تماش بینی میں طاق تھے، اڑا لے گئے۔ انہوں نے ایک مکان میں لے جا کے رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دل جوئی میں مصروف رہتیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں۔ اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھنکوا دیا۔ بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں۔ اگر آپ فرمائیے تو بلوا دی جائیں۔

رسوا۔ مجھے معاف ہی کیجئے۔

(3)

ہاتھ آئی مراد منہ مانگی
دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے میرے دل میں آئی، چلو درگاہ چلیں، زیارت ہی کریں۔ سرشام سوار ہو کے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو مردانی درگاہ کے صحن میں ادھر ادھر ٹہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں، حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے، انہیں سنا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے۔ انہوں نے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد ماتم ہوا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا۔ دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنانی درگاہ میں بھی ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملکہ کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دوچار مل ہی جائیں گی۔ اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چوپہلے پر پردہ ڈال کے زنانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ محل دار نے آکر سواری اتروائی۔ اندر گئی۔ میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے، شکایتیں، غدر کے حالات، ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں، دہنی طرف کی صحنچی سے کان پور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں، تولواں جوڑا پہنے ہوئے، چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پانچے سنبھالے ہوئے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھیا ہے، ایک لوٹیا خاص دان لئے ہے، ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے۔

بیگم:۔ اللہ امراؤ! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کان پور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو، وہ بھی اتفاق سے۔

میں:۔ کیا کہوں۔ جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی، اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آکے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر بھاگڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری۔ نہ مجھے آپ کا پتا تھا نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم:۔ خیر اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں۔

میں:۔ لکھنؤ کیسا، اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم:۔ اس کی سند نہیں۔ تمہیں میرے مکان پر آنا ہو گا۔

میں:۔ سر آنکھوں سے۔ مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بیگم:۔ چوپٹیوں پر۔ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔ پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب اتنے میں ایک مہری بول اٹھی "نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔"

میں:۔ آنے کو تو آؤں مگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم:۔ نہیں۔ وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں۔ اور پھر تمہارے واسطے؟ میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انہوں نے خود تمہیں کان پور میں کئی دفعہ ڈھونڈوایا۔ اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں:۔ اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم:۔ کب آؤ گی؟ وعدہ کرو۔

میں:۔ اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم:۔ اوئی۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہو گئیں۔ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں؟

میں:۔ اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی۔

بیگم:۔ اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے۔ پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے چلے جائیں۔

میں:۔ مناسب ہے، اتوار ہی کو سہی۔

بیگم:۔ کس وقت آؤ گی؟

میں:۔ جس وقت کہیے۔ مجھے گھر پر کوئی کام نہیں، ہر وقت برابر ہے۔

بیگم:۔ تم کہاں رہتی ہو؟

میں:۔ چوک میں سید حسن خاں کے چھاٹک کے پاس۔

بیگم:۔ اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی۔ اسی کے ساتھ چلی آنا۔

میں:۔ یہ بہت اچھا ہے۔

بیگم:۔ اچھا تو خدا حافظ!

میں:۔ خدا حافظ! ہاں تو کہیے، صاحب زادہ کیسا ہے؟

بیگم:۔ ہیں؟ ماشاء اللہ اچھا ہے۔ لو اب تم نے یاد کیا۔

kitaabiyat.pk

میں:۔ کیا کہوں، باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔

بیگم:۔ اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھالا ہے۔ اچھا اس دن اسے بھی دیکھ لینا۔

میں:۔ رات کی نیند حرام۔ لے اب کچھ نہ کہیئے۔ خدا حافظ!

بیگم:۔ خدا حافظ۔ دیکھو ضرور آنا۔

میں:۔ ایسی بات ہے؟

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا سلسلہ پھر چلا، کہنے لگی "بیگم صاحب! چلئے، دیر سے سواری لگی ہے۔ کہار موئے چلا رہے ہیں۔"

(4)

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی، مگر جب تک وہ جیتی رہیں انہیں اپنا سرپرست سمجھا کی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا، مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے ساتھ سے جدا نہ سمجھتی تھیں، مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دیئے، اس لئے اس سے انہیں نفرت سی ہو گئی تھی۔ لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آ گئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرا لے لیا تھا، مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرا خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔ میرا اسباب اس میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔ جب جی چاہتا تھا دو دو تین تین دن وہیں جا کے رہتی۔ سال بھر کہیں رہوں، مگر محرم میں تعزیہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعزیہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں۔

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔ جمعے کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے،

تمہیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کے گئی۔ انہیں دیکھ کر گھر پر واپس آنے کا ارادہ تھا کہ جی میں آیا ایک بھاری جوڑا نکالتی چلوں۔ کمرا کھولا۔ دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہوئے ہیں۔ پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے۔ فرش فروش الٹا پڑا ہے۔ ادھر ادھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے اگلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک وہ دن تھا کہ یہ کمرا ہر وقت کیسا سجا سجایا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی۔ بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام تک نہ تھا۔ تنکا تک کہیں پڑا نہ رہتا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی، اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ آدمی ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ذرا جالے تو لے لے۔" وہ ایک سیٹھا کہیں سے ڈھونڈ کے اٹھا لایا۔ جالے لینے لگا۔ اتنی دیر میں میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کر دری بچھائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھڑوائے۔ کوٹھری میں سے سنگار دان، پان دان، اگال دان اٹھا لائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں، جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاص دان تھا۔ پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آگیا۔ شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانے کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد کی حماقت، فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی صورت، غرضیکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آتے تھے، مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے۔ وہ کمرا اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ پھر دوسری سامنے آتی تھی۔ جب کل صورتیں نظر سے گزر گئیں تو یہ دور از سر نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دور جلد جلد ہوئے، اب ذرا توقف ہونے لگا۔ اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے، ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے دماغ کو چکر ہوا تھا، تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی تکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ، جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا، پھر انکا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں، شعر و سخن کا چرچا، خان صاحب کا مخل صحبت ہونا، بد زبانی کرنا، سلطان کا تمنچہ مارنا، خان صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جان نثاری، کوتوال کا آنا، خان صاحب کو

گھر پر بھجوا دینا، مگر پھر سلطان صاحب کا نہ آنا، محفل میں ان کو دیکھنا، لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا، پھر از سر نو رسم ہونا، نواز گنج کے جلسے، یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے۔ مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا تو طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی:۔ بیوی! دیکھئے، وہ کنکھجورا آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔

میں اوہی کہہ کے اٹھی۔ جلدی سے دوپٹا اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹا اتار کے جھاڑا۔ کنکھجورا پٹ سے گرا اور رینگ کے پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایہ اٹھایا۔ اب جو دیکھتے ہیں تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی:۔ (بہت ہی متعجب ہو کے) ہائیں! اے لیجئے، یہ کیا ہے!

میں:۔ (دل میں) اہاہ! اشرفیاں ہیں! (آدمی سے) اشرفیاں ہیں!

آدمی:۔ واہ! اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں:۔ (ہنس کے) وہ کنکھجورا اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی پہلے تو جھجکا، پھر پانچوں اشرفیاں مجھے حوالے کیں۔

رسوا:۔ تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا؟

امراؤ:۔ لٹا کیوں نہیں۔ مگر فرض کر لیجئے کہ میرے پلنگ کا پایہ کسی نے اٹھا کے نہیں دیکھا۔

رسوا:۔ ممکن ہے۔

(5)

کسی طرح سے ہو تسکین شوق کیسا رشک
ملیں گے آج ہم ان سے رقیب سے مل کے

اتوار کے دن 8 بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری فینس اور کہار لے کے سر پر سوار دل ہو گئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ پینے بھی نہ پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں

سمجھتی تھی کھانا دانا کھا کے جانا ہو گا۔ مہری نے کہا۔ "بیگم صاحب نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا یہیں آ کے کھانا"۔ میں نے پوچھا "نواب صاحب گھر پر ہیں؟" اس نے کہا۔ "نہیں۔ صبح اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔" میں نے پوچھا۔ "کب آئیں گے؟" مہری نے کہا۔ "اب آئیں تو کہیں شام کو آئیں۔" مجھے بیگم سے تخلئے میں بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اس لئے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو، کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن، ایک ملا کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا، بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ دستر خوان بچھا۔ میں نے اور بیگم صاحب نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پراٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چاولوں کا خشکہ، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوہ سوہن، کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں۔

بیگم:۔ کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں؟

میں:۔ چپ بھی رہو۔ کہیں کوئی سن نہ لے۔

بیگم:۔ سن لے گا تو کیا ہو گا۔ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لئے مول لیا تھا۔

میں:۔ برائے خدا چپ رہو۔ کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے منہ ہاتھ دھویا، پان کھایا، مہری نے حقہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں:۔ بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم:۔ جب تمہیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا، اسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی رہی تھی۔ دل میں کہتی تھی میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے۔ مگر کہاں دیکھا ہے؟ کیوں کر دیکھا ہے؟ یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی، کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام یاد آ گیا۔ دل نے کہا۔ اوہو انہیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں:۔ میرا بھی یہی حال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والیوں میں خورشید ہے۔

اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی، تم یاد آجاتی تھیں۔

بیگم۔ اب میرا حال سنو۔

میں تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النسار بیگم صاحب کے ہاتھ بکی ہوں۔ تمہیں یاد ہو گا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہو گا۔ نواب کو سولہواں برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نااتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نااتفاقی تھی، اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہئے، ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔ نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب جائیداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انہی کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت میں بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں۔ نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہے۔ میری ظاہر میں تو کبھی کسی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ یوں باہر اپنے دوستوں آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں۔ کچھ ان کے پیچھے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی، خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا نبن کو پروان چڑھائے۔ بہو بیاہ لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی، مجھے اپنی قسمت پر افسوس آرہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی "تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر، بکی بھی تو کہاں، رنڈی کے گھر میں۔ اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی